ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

Vol.3 No.4 2020

بانو قدسیہ کے افسانوں میں انسان دوستی کے عناصر

Elements of Humanism in Banu Qudsia's Short Stories

صائمہ اقبال 1 ،روبینہ یاسمین 2،سدرہ نذیر [3]

Abstract:

With the passage of time: when the exploitative forces raised their heads and classes and divisions arose in human beings.Some people came to realize that for their greatness there should be a party that would protect their rights and make man aware of his position. Irrigation of this consciousness was possible only through the humanitarian movement. Banu Qudsia writes in a moderate manner for the exploitative forces, the weak, the arrogant elements.This article represent the best examples of Banu Qudsia's philanthropy. She proves to be humane through her short stories that she knows the black and white of society.

Key words: Humanism, Bano Qudsia,Short stories,Aatish .e.zerepaa ,Dast basta ,Saman.e. wajood , Na qabal .e.zakir, Dosra darwaza, Towaja ki talib.

روزافزوں ٹیکنالوجی نے جہاں زندگی کو اس قدر آسان بنایا ہے۔ آسائش و آرام کی اس زندگی نے دنیا کو تفرقات کی روش سے بھی آگاہ کیا ہے۔ امارت و غربت کے آلام ہر خطے میں دکھائی دیتے ہیں۔ دکھی انسانیت کی مساعی کے لیے وہ جذبہ مفقود نظر آتا جس سے ان کی دادرسی مطلوب و مقصود تھی۔ ترقی نے نچلے طبقے کو شدید نقصان پہنچایا غلامی کا ایک ابدی طوق ان کے گلے میں لٹکا دیا۔ چنانچہ مختلف نظامِ ہائے زندگی کے ہوتے ہوئے وہ تمام نظریات جو انسان کی فلاح وبقا کے لے بنائے گئے ناکافی محسوس ہونے لگے۔ تو ایسی صورت میں انسان دوستی کی تحریک ابھری جس نے انسان کو انسان کی ضرورت و اہمیت کی طرف خاطر خواہ توجہ صرف کرنے پر زور دیا۔

لفظ انسان دوستی جس کا مترادف Humanism دراصل ایک لاطینی لفظ ہے۔ یہ لفظ Humansim دو الفاظ کا مرکب ہے جو کہ بالترتیب "Homo" اور "Genus Humans" ہیں۔ "Homo" بمعنی "انسان" جب کہ دوسرا لفظ "Genus Humans" کا مطلب "انسانیت" ہے۔ لفظ کی ساخت ہی اس بات کی عکاس ہے کہ یہ تحریک کس قدر انسان اور اس کے گردوپیش سے علاقہ رکھتی ہے۔

"قومی انگریزی لغت" میں بھی "Humanism" کے معنی کچھ اس انداز میں بتائے گئے ہیں:

"انسان نوازی، انسان دوستی، مذہب انسانیت، انسان پسندی، مسلک انسانیت، انسان پرستی وہ نظام یا فکر و عمل کا مسلک جس میں انسانی اور دنیاوی مفادات حاوی ہوتے ہیں، انسان دوست مفکرین کے ادب اور خیالات میں پھر سے دلچسپی، جنھوں نے مذہب کو کم اہم قرار دیا۔"(1)

"قومی انگریزی لغت" کی تعریف جو وہ انسان دوستی کے حوالے سے کرتے ہیں اور اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ مرکز و محور انسان کی ذات ہے۔ وہ تمام افکار و نظام جو انسان کے لیے اس کی بھلائی مفادات کے پیشِ نظر ہوں گے وہ انسان دوستی ہی ہے۔

"آکسفورڈ ڈکشنری" میں اس کے معنی کچھ یوں رقم ہیں:

Devotion of those studies which permote human culture, literally culture, especially the system of the humanists, the study of the Roman and Greek classic which came into vogue at the Renaissance."(2)

---

[1] لیکچرار، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

[2] شعبہ اردو گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد

[3] ایم فل اسکالر، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

انسان دوستی ایک ایسا نظامِ فکر ہے جس میں فرد کو بذاتِ خود اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب وہ وقت آیا جب استحصالی قوتوں نے سر اٹھایا اور انسانوں میں طبقے اور تفرقے وجود میں آئے۔ انسان کی زندگی کو دوبھر کیا جانے لگا تو با قاعدہ افراد کے اندر اس بات کا شعور آیا کہ ان کی عظمت کے لیے کوئی ایسی جماعت یا گروہ ہونا چاہیے جو ان کے حقوق کا تحفظ فراہم کرے۔ اس شعور کی آبیاری انسان دوستی تحریک کے ذریعے ہی ممکن تھی اور اس کا وجود تب منظرِ عام پر آیا جب کلیسا کی تعلیمات اور اصول و ضوابط نے غیر انسانی سلوک کو روا رکھنا جائز کر دیا تھا۔ انسان دوستی کی اصطلاح 1808ء میں ایک جرمن ادیب (F.J.Neihemmer) نے وضع کی لیکن اس کا اجرا بعد ازاں اٹلی میں ہوا۔ اٹلی کا مشہور ادیب اور شاعر پیٹرارک (Petrark) انسان دوستی "Humanism" کا بانی کہلاتا ہے۔

پیٹرارک ایک رجحان ساز با عمل شخص تھا۔ اس نے اس کو تحریک کی شکل دی اور با قاعدہ طور پر اپنی فکر، اپنے فلسفے اور عمل کے ذریعے سے انسان دوستی کو پروان چڑھایا۔ اس کے پس منظر میں کلیسا کی نفی کے تاثرات تھے۔ اس نے عمل کو نا صرف اپنے لیے بلکہ اجتماعی طور پر اپنانے کی تبلیغ کی۔ عقیدے کے پیروکار بن کر رہنے سے زندگی نہیں سنورتی یہ پیٹرارک کا بنیادی درس تھا۔ اس نے فلسفے اور شاعری کے ذریعے سے اس کا پرچار کیا۔

انسائیکلوپیڈیا آف فلاسفی کے مطابق:

"ہیومینزم وہ فلسفیانہ اور ادبی تحریک ہے جو چودھویں صدی کے نصف ثانی تک اٹلی میں پیدا ہوئی اور وہاں سے یورپ کے دوسرے ممالک میں پھیل گئی جو بالآخر جدید ثقافت کی تشکیل کے اسباب میں سے ایک سبب بنی اور ہیومینزم ہر اس فلاسفی کو بھی کہتے ہیں جو انسانی قدر باعزت کو تسلیم کرے اور اسے تمام چیزوں کا میزان قرار دے یا جو صرف انسانی طبیعت کو اپنی فکر کی حد یا دائرہ کار کی حیثیت سے لے۔"(3)

اٹھارہویں صدی کے بعد اس تحریک کو ایک خصوصی فروغ کی آب و ہوا میسر آئی اور اس نے حدود و قیود کے تمام بند توڑ کر پھلنے پھولنے کا مظاہرہ کیا۔ 1933ء میں شکاگو یونیورسٹی کی طرف سے منعقدہ ایک کانفرنس میں پہلا "انسان منشور" Humanist Menifesto پیش کیا۔

بعد ازاں دیگر تمام تحاریک جو وجود میں آئیں سب نے کسی نہ کسی صورت اس سے استفادہ کیا اور تین صدیاں گزرنے کے باوجود اس تحریک کی مقبولیت میں قدرے کمی نہیں آئی بلکہ روز بروز اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ تمام الہامی مذاہب میں بنیادی اور مشترک تعلیم فلاحِ انسانیت کی تھی۔ دینِ اسلام میں منبع و ماخذ انسانیت ہی ہے۔ تمام تر احکامات خداوندی جو اس نے اپنے برگزیدہ نبی اکرم (ﷺ) کے ذریعے سے دنیا کے لوگوں کو دیے ان سب میں ایک معتدل و شاداب انسانی معاشرے کی تصویر جھلکتی ہے۔ انسانی حقوق و فرائض کے ضمن میں بڑے واضح الفاظ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"بے شک اللہ تعالیٰ تم کو عدل و احسان کرنے اور قرابت داروں کو (مدد کے لیے خرچ) دینے کا حکم دیتا ہے اور فحش باتوں، بری عادات، نیز سرکشی سے منع فرماتا ہے وہ (اللہ تعالیٰ) تمھیں وعظ کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔"(4)

انسان دوستی کی تحریک معرضِ وجود میں آئی تو دنیائے ادب نے اپنے تخلیقی شعور کی جولانیاں بروئے کار لاتے ہوئے ظلم و جبر کی چکی میں پستے ہوئے انسانوں کی زندگی صفحہ قرطاس پر لانے کی اپنے اپنے طور پر بھرپور سعی کی۔ اردو ادب بھی اس ضمن میں کسی بھی ادب سے پیچھے نہیں رہا۔ اردو ادب میں افسانے کے دریچے کو کھولا جائے تو لامحالہ بہت سے ایسے در ہم پر وا ہوتے ہیں کہ جن سے انسانیت سسکتی نظر آتی ہے۔ ادباء نے اپنے گردو پیش کے عوامل کا جائزہ لیا اور ان سے وہ کردار لیے جو پورے معاشرے کے عکاس ہیں۔ ادیب اپنے معاشرے کے انسان کی آواز بنا۔ اردو افسانے میں انسان دوستی کی روایت کے سلسلے میں چند نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہمیں بانو قدسیہ بھی نظر آتی ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں میں انسان دوستی کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

Vol.3 No.4 2020

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

بانو قدسیہ نے اپنے افسانہ نگاری کے فن کو کچھ اس طرح سے برتا کہ اس سے معاشرتی اونچ نیچ اور باہمی معاملات کی ایک دستاویز کے طور پر پڑھا جا سکتا ہے۔ ان کے افسانوں کی فضا متوسط طبقے سے عبارت ہے۔ وہ زیادہ تر ان لوگوں کو لے کر لکھتی ہیں جنھیں بظاہر ہر زندگی مکمل اور شاد لگتی ہے لیکن ان دریچوں میں اگر جھانکا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے عوامل اب بھی ہیں جو ان کو بھی باقی تمام افرادِ عامہ کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ بانو قدسیہ کے افسانوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو انسان دوستی کے بیسیوں ابواب وا ہو جاتے ہیں۔ بانو قدسیہ کی اسی انسان دوستی کی چیدہ چیدہ مثالیں درج ذیل ہیں۔ وہ اپنے ان افسانوں کے ذریعے سے انسان دوست ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

بہوا

بانو قدسیہ کے افسانے "بہوا" میں ایک لڑکی "بہوا" اس کا مرکزی کردار ہے۔ سلیقہ وگھر داری میں ایک طاق عورت اور اوپر سے حسن کی ملکہ خوبصورتی خداداد لیکن قسمت کی بری کہ وہ ایسے شخص کے ساتھ بیاہ دی گئی جسے اس کی قدر و قیمت کا احساس تک نہ تھا۔ ایک بچے کی کمی نے بہوا کی زندگی کو اجیرن بنا دیا۔ وہ سلیقے والی حسن والی ایک مرد کو رام نہ کر سکی اور بچے کی کمی کی وجہ سے تین سال تک جبر مسلسل کا شکار رہی اور آخر ایک دن گھر سے نکال دی گئی۔

جب کہ کہانی میں دوسری طرف ایک صاحب بہادر ہیں۔ جن کو یہ نعمت خداوندی جلد ہی دے دی گئی اور وہ اس سے منکر ہیں۔ بہوا کو صاحب بہادر کی اس خوشی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اپنا گھر چھوڑ کر اس کا شوہر اسے گھر سے جانے کا کہتا ہے اور ماممتا پر چوٹ کرتا ہے۔

"دیکھتی نہیں، دو مہینے آئے کو نہیں ہوئے اور دلہن امید سے بھی ہو گئی۔ تجھ ایسی کوکھ جلی سے میں کب تک نباہ کروں گا۔ جا یہاں سے جا۔"[5]

مرد کو خوش کرنے کا پیمانہ عورت کبھی بھی نہ حاصل کر سکی۔ وہ اپنی آخری حد تک جاتی ہے لیکن خالی لوٹ آتی ہے۔ نسلِ انسانی کی بڑھوتری اور اس کے ارتقائی مراحل کا انسان کے دائرہ اختیار سے قطعی کوئی تعلق نہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم انسان اپنے سے کمزور صنف کے ساتھ اس بدسلوکی کے مرتکب ہوں۔ بانو قدسیہ نے ایک ماہر نباض کی طرح بڑی عمدگی سے انسان دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے اس حقارت کا نشانہ بننے والے افراد کی آواز کو اپنی کہانی کا روپ دیا ہے۔

خودشناس

خودشناس ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جس نے دولت کی ریل پیل کے درمیان آنکھ کھولی۔ وہ افراد جن کے نزدیک انسانیت کا درد ایک تشہیر کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ لیکن خلافِ توقع نوجوان کی تیسری آنکھ کو قدرت وا کر دیتی ہے اور وہ اس معاشرے کے اثرات جو اس کے خاندان پر برسوں بلکہ صدیوں سے پڑے ہوتے ہیں ان کو قبول کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اس کی دولت اور عیش و عشرت والی زندگی اس کے ضمیر کو تھپکی دے کر سلانے سے قاصر رہتی ہے۔ خودشناسی انسانیت کی اولین شرط ہے۔ جنھیں ازل سے ہی اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ اسی لیے ابراہیم کہتا ہے:

"معاشرے کے گناہوں اور جرائم کی شرمساری اپنی گردن پر لے کر مرنا نہیں چاہتا۔"[6]

ابراہیم جانتا ہے اس بات کی حقیقت کو کہ فردِ واحد ہو یا پورا معاشرہ سب کے لیے انسان دوستی کا جذبہ ہونا چاہیے۔ بانو قدسیہ نے ابراہیم کے کردار کے ذریعے سے ان بالا طبقوں کی شان و شوکت اور ہیومن ازم کے پرچار کی نقاب کشائی کی ہے۔

چھمو

چھمو ایک غریب سبو ملازمہ کی بیٹی اور ہمارے معاشرے کے ملازم جن کی اپنی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ ہم لوگ ہندوؤں سے الگ تو ہو گئے ہیں لیکن ہندوستان کی ازلی طبقاتی تقسیم ہمارے معاشرے کی جڑوں میں بیٹھ گئے۔ یہاں کوئی فرق نہیں پڑتا اگر ملازم کی عزت و آبرو پہ آنچ آئے۔ کوئی مذائقہ نہیں اگر ان تعلقات کو استوار کر کے انھیں داغدار کر دیا جائے۔ چھمو بھی ایک ایسے ہی الیے کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ افسانے میں آتا ہے:

"چھمو بیگم صاحبہ کے پیروں کے پاس بلی کے ساتھ بیٹھی ہڈیاں چاٹ رہی تھی۔ شاید وہ ہمیشہ یہیں بیٹھتی تھی۔"(7)

ایک بلی اور ایک انسان کے بچے کے درمیان ان اشراف کی نظر میں کوئی فرق نہیں۔ انھیں اپنے پالتوؤں سے زیادہ لگاؤ ہو گا۔ مصنفہ سوال یہ اٹھاتی ہیں کہ جب چوبارے کی اینٹ بذاتِ خود تمام حدیں پار کر کے موری میں آ لگتی ہے تب اس کی شان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تو کیا قباحت ہے اگر یہ نسلی امتیاز مٹا کر انسانیت کے رشتے کے تحت باعزت طریقے سے کسی انسان کی تکریم کر لی جائے۔

واماندگیٔ شوق

بانو قدسیہ نے زندگی کو کسی ایک رنگ سے نہیں دیکھا بلکہ مختلف پہلوؤں سے اسے دیکھنے اور ان کے حوالے سے متاثر کرنے والے عناصر کو اُجاگر کرتی ہے۔ "واماندگیٔ شوق" ان کی ایک ایسی کہانی ہے جس میں معاشرے کے ایک ٹھوس اصول پر چوٹ کی گئی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار "پولی" جس کو عمر بھر کسی کی رفاقت نہیں ملتی ہے۔ مقصود وہ شخص جو پولی کی زندگی میں آیا اور محبت کا دعویٰ دار بنا لیکن وہ معاشرتی اصولوں کی خلاف ورزی کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا اور اسی بات نے بالآخر اسے اپنی جان لینے پر مجبور کر دیا۔ بانو قدسیہ مقصود اور پولی کے روپ میں ہمارے اس انسانیت سے بے بہرہ معاشرے کی رسومات اور رواجوں پر بات کرتی ہیں کہ کیسے یہ اندھے پن کا مظاہرہ کر کے جذبات سے کھیلتے ہیں اور روز بروز قیمتی جانوں کا زیاں ہوتا ہے۔ افسانے سے ایک اقتباس:

"ٹریجڈی یہ نہیں کہ اسے محبت سے محبت نہ ہوئی۔ ٹریجڈی یہ ہے کہ اس نے زندگی جیسی نعمت کی قدر نہیں کی۔ کاش وہ زندہ ہوتا۔ کاش اسے علم ہوتا کہ انسانی زندگی کتنی قیمتی ہے۔"(8)

بانو قدسیہ کا محرک دراصل افسانے کی یہ آخری چند سطریں ہی ہیں کہ انسان محض اپنے ذات پات، رنگ نسل کے قوانین کی پاسداری کرتا ہے اور وہ انسانی جان جس کی حرمت عرشِ معلیٰ سے ثابت ہوتی ہے اور دھرتی کے انسان کو اس کی قدر نہیں یہ غیر انسانی رویے ہیں جو انسانیت کے قتلِ عام پر تلے ہوئے ہیں۔

ٹھنڈا عذاب

بانو قدسیہ کی یہ کہانی "ٹھنڈا عذاب" ایک ایسے عذاب کی کہانی ہے جس میں "حارث" اپنی بیوی جمیلہ کو جھونک دیتا ہے۔ حارث کی زندگی میں بہت سی لڑکیاں جمیلہ سے پہلے بھی آئی تھیں اور جمیلہ کے بعد بھی آتی ہیں۔ وہ جمیلہ کو اپنی بیوی بناتا ہے۔ لیکن وہ ان ذمہ داریوں سے بے بہرہ ہے جو اس نے نبھانی ہوتی ہیں۔ زوجین کے رشتے میں وفا کی اہل صرف عورت ہی ہوتی ہے۔ کیا مرد محض انسان دوستی کا تقاضا بھی پورا کرنے کا اہل نہیں:

" پھر اچانک حارث نے راجہ رام چندر کی طرح ایک دھوبی کے کہنے پر نہیں بلکہ تیسرے درجے کے ڈاکٹر کے مشورے پر جمیلہ کو گاؤں بھیج دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں کھلی ہوا میں جمیلہ بہت تندرست ہو جائے گی۔

جب جمیلہ سٹیشن پر اتری اور گڈے میں سوار ہوئی تو اسے معلوم تھا کہ یہ بن باس، سانس کے آخری پیام تک کا ہو گا۔ یہاں کچی دیواروں سے اڑتے ذرّوں اور مکئی کے دانوں کی خوشبو میں اس نے دو سال گزارے اور جب آخری وقت آیا تو حارث اس کے پاس تھا۔۔۔ جمیلہ بیماری سے نہیں خوف سے مر گئی۔"(9)

جمیلہ بیماری سے نہیں خوف سے مری بے مروتی اور بے مہری کے خوف سے جو حارث سے ملا۔ انسان دوستی کا تقاضا ہے کہ ہر رشتے کا حق ادا کیا جائے اور محبت کا برائے نام ڈھونگ رچا کر کھلواڑ نہ کیا جائے۔

لال گیند

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

لال گیند ایک ایسی کہانی جس میں بڑے مختصر پر اثر انداز میں انسانیت کی باطنی کیفیت کا انکشاف ملتا ہے۔لال گیند لگے لپٹے انداز میں بظاہر ایک اغوا کی کہانی معلوم ہوتی ہے لیکن گہرائی میں جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نہایت باریکی سے انسان کی پرتیں اترتی ہیں۔جو ظالم ہے آخرہ وہ بھی تو انسان ہے مصنفہ اس بات کو بڑی روانی سے کہہ جاتی ہے۔ معاشرتی عوامل ہی ظالم کو ظالم بنانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ نہیں تو انسانی خون تو ان میں بھی ہوتا ہے۔ بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

"ظالم کے کلیجے میں بھی درد ہوتا ہے لیکن وہ اسے مظلوم کے لیے استعمال نہیں کرتا۔"(10)

ظالم کو ظالم بننے کے لیے بھی کوئی اسباب مہیا کیے گئے ہوں گے یہ انسان دوست رویے کی معراج ہے کہ مصنفہ ایسے کرداروں میں بھی اس حساس جذبے کا ادراک حاصل کرتی ہیں اور قاری پر مثبت اثر ڈالتی ہیں۔

مجرا

افسانہ "مجرا" ایک ایسے ان پڑھ جاگیر دار نواب صاحب کا ہے جسے اثر ورسوخ اور رعب و دبدبے کی لت لگی ہوئی ہے وہ گاؤں والوں کو تو ماتحت کر تا ہی ہے اب شہر والوں پر بھی اپنی دھاک بٹھانا چاہتا ہے۔ اپنے اثر ورسوخ کے لیے وہ الیکشن لڑنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ گاؤں کے منشی سے تقریر لکھنوانے کو اپنے ایک پالتو نوکر پھتے کو بھیجتا ہے تو منشی منع کر دیتا ہے۔ منشی کے انکار کی سزا اسے اتنی بھیانک ملتی ہے کہ انسانیت پانی پانی ہو جاتی ہے۔وزیر علی اپنے لیے تقریریں تو شہر سے لکھوا لیتا ہے لیکن تقریریں نہ لکھنے پر گاؤں میں کیا قیامت برپا ہوتی اس کا احوال کچھ اس طرح سے ہے:

"وزیر علی نے اپنے لیے شہر سے بیس اجلی اور نفیس تقریریں بھی لکھوا لیں اور پھتے سے کیا ہوا وعدہ بھی پورا کر دیا۔ جس روز نوراں رات کو اٹھوائی گئی اس کی دوسری صبح کنویں میں ملا زادہ منشی جی کی لاش مرے ہوئے مینڈک کی طرح تیر رہی تھی۔"(11)

بانو قدسیہ کے مطابق ایسے عناصر ہی معاشرتی رویوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انسان دوستی کہیں نیچے ہی دب جاتی ہے۔ محض اپنی خواہشوں کا محل استوار کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ کیسے کیسے انسانیت کی بلی چڑھا رہے ہیں۔

شکرانہ

شکرانہ ایک ایسے المیے کی کہانی ہے جو کہ تقریباً ہر دوسرے گھر میں سننے کو ملتی ہے۔والدین اولاد کو پالتے ہیں۔ لیکن یہی اولاد ان کے بڑھاپے کے دنوں کو جبر مسلسل کی اذیت سے دوچار رکھتے ہیں۔عورت کا بڑا المیہ ہے کہ اس کا جھکاؤ اپنے ماں باپ کی طرف پیار محبت اور شفقت کا ہوتا ہے اس کے برعکس وہ ایک طرح سے یکسر مختلف کردار نظر آتی ہے اپنے ساس سسر کے لیے۔ کیا قباحت ہے کہ اگر سسرال میں بھی وہی بول محبت کے الاپے جائیں جن بولوں کے بولنے سے وہ اپنے میکے اور گھر کی رونق کہلاتی ہے۔ شکرانہ کی "بڑی بہو" نے اپنے سسر کے لیے کبھی کوئی عزت و تکریم کے بول نہ بولے اور نہ ہی کبھی ایسا سوچا وہ دو وقت کی روٹی دینے کو بھی کوفت محسوس کرتی۔ بڑی بہو کی ذہنیت کو مصنفہ نے یوں بیان کیا ہے:

"کچھ بھی ہو بہو۔۔۔ یہ بات دوبارہ نہ ہو۔۔۔" شاہ جی تو یہ کہہ کر واپس چل دیے لیکن انہوں نے بڑی بہو کی آواز سن لی۔وہ زبیدہ سے کہہ رہی تھی۔ ہمارے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں اور اوپر سے گھمنڈ دیکھو۔ زیادہ سے زیادہ اپنی بیٹی کے پاس ہی چلا جائے گا نا، خس کم جہاں پاک۔ میں تو دو نفل پڑھوں گی شکرانے کے۔"(12)

مصنفہ اس میں اس نکتے کو اجاگر کرتی ہیں آیا کہ سسرالی ماں باپ کا اس تکریم سے کوئی واسطہ نہیں یا اب انسان بذاتِ خود ہی منافق ہو گیا ہے۔ دوہرے معیار کا حامل جہاں ضرورت ہوئی انسان دوستی برت لی اور جہاں نہ ہوئی وہ طعنہ و تشنیع سے کام چلا لیا۔

ابن آدم

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ابن آدم افسانہ میں مصنفہ ان لوگوں کا ذکر کرتی ہیں جو صرف دولت کی وجہ سے انسانوں کی عزت کرتے ہیں۔ فقیر حسین جس کو جمیلہ کی بے جی بھک ننگا، کنگلا کہہ کر رفع دفع کرنے کے لیے کوشاں تھی اور ایک دن اس نے بھرپور ابال نکال ہی دیا۔ کیا عزت صرف دولت، شہرت رکھنے والوں کو ہی ملتی ہوتی۔ انسان دوستی کا کوئی تقاضا نہیں۔

"جمیلہ ہم نے تیری خواہش کا احترام کیا۔۔۔ سارے اصول توڑ کر۔۔۔ ہم نے تجھے یہ آزادی نہیں دی تھی یہ اس بے عزت کنگلے کو ہمارے منہ کی کالک بنا دے۔۔ آپ ہی تو کہا کرتی ہیں عزت اور دولت خدا دیتا ہے۔۔۔ وہ کسی سفارش سے تھوڑی دیتا ہے، ان کو بھی دے گا بے جی۔۔۔"(13)

وہ بے جی جس نے اپنی بیٹی کو تعلیمات تو انسان دوستی کی دیں لیکن ان پر عمل سے کوسوں دور ہیں۔ اس کردار سے مصنفہ معاشرے کے دوغلے کرداروں کی عکاسی کرتی ہیں جو کہتے کچھ ہیں اور عملی زندگی میں ان کا وطیرہ کچھ اور ہوتا ہے۔

خاکستری بوڑھا

انسان کا خمیر رشتوں سے بنا ہوا ہے۔ وہ رشتوں کو چھوڑ تو سکتا ہے لیکن بھول نہیں سکتا۔ وقت کے سمندر میں جتنی مرتبہ مرضی غوطہ زنی کی جائے ہم رشتوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے اور بچھڑ جانے والوں میں تو ویسے بھی بلا کی کشش ہوتی ہے۔ تنزیلہ کو بازار کی بھیڑ میں بارش کے موسم میں ایک بوڑھا نظر آتا ہے، وہ بوڑھا جس سے اس کے کسی عمر کا رشتہ جڑا تھا کسی دیرینہ رفاقت کے سبب وہ رفاقت جسے خیر باد کہے ہوئے بھی تنزیلہ کو بیس برس بیت گئے تھے۔ لیکن بوڑھے کے لیے تنزیلہ کی دوڑ دھوپ اور فکر کا عالم ایک عجب سی فضا کو پیدا کرتا ہے:

"وہ کہنا چاہتی تھی پہلا شوہر رہے نہ رہے، کوئی سسر کو تھوڑی بھولتا ہے کبھی۔۔۔ لیکن بغیر خدا حافظ کہے، وہ دوکان چھوڑ گئی۔۔۔ اچانک بارش پھر زور سے ہونے لگی تھی۔"(14)

"اچانک بارش پھر زور سے ہونے لگی تھی" یہ موسم کی بارش تھی یا تنزیلہ کے اندر کی گھٹا کے بادل تھے جو پلکوں کے بند لانگ کر زور کی بارش کا سبب بنے۔ گزشتہ رشتوں کی کسک محسوس ہونا انسانیت سے لبریز ہونے کی نشانی ہے کہ انسان جن مراحل سے بھی گزرے انسان دوستی کا رشتہ تو بہر حال قائم رہتا۔

گچھی مار

گچھی مار میں بانو قدسیہ ایک ایسے ہی انسانی رویے کی عکاسی کرتی ہے۔ انسان کی سرشت میں تضاد رکھا گیا ہے۔ قدرت کی طرف سے ہی وہ اچھائی اور برائی دونوں کے عوامل سے متاثر ہوتا ہے۔ خیر و شر دونوں اس کو گھیرتے ہیں لیکن اس میں انسان کے لیے امتحان ہوتا ہے۔ پروفیسر کو ایک جذباتی قدم کی اس قدر بھاری ذلت آمیز قیمت چکانی پڑے گی یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے:

"چلتے چلتے پروفیسر مجیب اس نتیجے پر پہنچے کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ عمر سے بہتر ہے۔ وہ اب سکیم بنا رہے تھے کہ کس طرح وہ شیر کی مانند ایک ہی جست میں خودکشی کر کے سارا حساب چکا دیں گے۔"(15)

پروفیسر مجیب کے اس فیصلے کے پیچھے پروفیسر قدیر تھے۔ جنھوں نے ایک انسان کو اس نہج پر پہنچا دیا کہ وہ موت کو زندگی پر ترجیح دیں کیونکہ وہ کسی دوسرے انسان کو بذات خود کامیاب دیکھنے کے عادی نہ تھے جب تک کہ وہ ان کے ماتحت نہ ہو۔ کوئی کامیابی کے زینے بھی چڑھے تو پروفیسر قدیر کا اس پر احسان ہو۔ یہ ایک پڑھے لکھے جاہل طبقے کی نمائندگی کا کردار ہے جو تعلیم جیسے زیور سے آراستہ ہونے کے باوجود انسان دوستی سے عاری ہے۔

بڑا بول

بڑا بول ایسی کہانی ہے کہ جس کو پڑھ کر ایک بار تو رونگٹے کھڑے ہو ہی جاتے ہیں۔ قدرت کیسے انتقام لیتی ہے وہ کس طرح سے امارت و غربت کے فرق کو مٹا کر ایک جیسا درد محسوس کروانے پر قادر ہے۔ "بڑا بول" وہ ہے جو چودھرائن بولتی ہے شادو کی مریاں کے بن بیاہی ماں ہونے کا سن کر یہ سب کیوں، کس لیے اور کس نے کیا۔ چودھرائن نے اتنے سوال داغ دیے کہ شادو جواب دینے سے قاصر رہی اور شادو کیا کرتی خود مریاں نے بھی اپنی زبان سے ایک لفظ تک نہیں اگلا۔ مریاں نے موت کی اذیت تو برداشت کر لی لیکن اپنے منہ کو تالا لگا لیا۔ وہ اس اذیت سے دوبار گزری اور چودھرائن کے کان پر جوں تک نہ رینگی کہ مزارعوں کی آبروریزی کا حق بھی ان کے مالکوں کو ہی صرف ہوتا ہے۔۔ غریب انسانیت کے لیے یہ جاگیردار طبقہ کس طرح کے خیالات رکھتا ہے بانو قدسیہ نے اس عکاسی ان الفاظ میں بڑی فنی مہارت سے کی ہے:

"چودھرائن کو یہ ضرور معلوم تھا کہ غریبوں پر مصیبتیں ٹوتی ہیں لیکن یہ کہ انھیں کوئی عزت وغیرہ کا مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے یہ اس کے لیے نئی بات تھی۔"(16)

چودھرائن کو اس بڑے بول کی قیمت اسے اپنی جان سے بھی عزیز بیٹی عصمت کے روپ میں چکانی پڑی۔ اسے تب احساس ہوا کہ امارت و غربت سے قطع نظر انسانیت کے دکھ درد، خوشیوں کے احساس یکساں ہیں یہ تقسیم انسان کی اپنی ہے قدرت کی نہیں۔ جب عصمت بھی مریاں بنی تو چودھرائن بھی شادو کے روپ میں آگئی اور سارے ٹھاٹھ اس دن ہونے والی بارش میں بہہ گئے۔

روس سے معذرت کے ساتھ

یہ اس دور کی کہانی ہے جس نے مشین کو فروغ دیا تو انسان کے کام سہل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی ساخت بھی مشین کے مطابق ہی نشوونما پانے لگی۔ بیسویں صدی کے نت نئے نظریات جو انسانی زندگی کو سہولت پہنچانے والے ہیں لیکن ان نظریات نے ایک اور نظریے کو جنم دیا۔ وہ احساس برتری کا نظریہ ہے۔ "روس سے معذرت کے ساتھ" بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے۔ معلوماتی بھی ہے اور سیاحتی بھی لیکن سمرو اور سونیا جو کہ ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوتے وہ اس بات کا اعتراف نہیں کر پاتے کیونکہ ان کے نظریات ان کے درمیان حائل تھے:

"کبھی کبھی کوئی مشن کوئی آدرش کوئی تخلیقی اُپج انسان کو انسان کے قریب کرنے سے معذور رکھتی ہے۔ مذہبی حد بندی، نسلی حدود، زبانوں کا اختلاف، دیس کی سرحدیں کئی ناگزیر حالات محبت کے راستے کا اندھا شیشہ ہیں۔ یہ حالات، صرف، اونچ نیچ ہمیشہ سے مختلف روپ دھارتی رہی ہے۔ لیکن پہلے انسان جس حد تک دوسروں کی محبت کا محتاج تھا۔ اب نہیں رہا، اب وہ انسان کی جگہ اشیاء اور نظریوں کا زیادہ محتاج ہو گیا ہے۔"(17)

بیسویں صدی کے انسان کی انسانیت اور انسان دوستی، نظریوں کی بھینٹ چڑھ گئی کہ وہ محبت جیسے لطیف جذبے کو بھی بے لوث ہو کر محسوس نہیں کر سکتا۔ بانو قدسیہ نے اس افسانے کے ذریعے سے نظریات کے بل پر ہوتے ہوئے انسانی جذبوں کے استحصال پر سے پردہ اٹھا کر قاری کو اس سے خبردار کروانے کی ایک موہوم سی کوشش کی ہے۔

بیٹے کا خط

حاکم علی کا بیٹا جو اس کی کل کائنات تھا کویت میں تھا۔ بیٹے کو اپنے باپ کی تنہائی کا شاید کبھی خیال نہ آیا یا پھر اسے اس سب کا سوچنا ایک اضافی امر لگتا ہے۔ حاکم علی شیداں ایک کام کرنے والی سے شادی کر کے اپنی تنہائی کا مداوا کرتا ہے اور اسے ایک دن بیٹے کا خط ملتا ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں سمیت ہمیشہ کے لیے کویت سے پاکستان آ رہا ہے۔ جس سے حاکم علی کے بڑھاپے میں ایک ایسا قہر ٹوٹتا ہے کہ وہ شدید پریشان ہو جاتا ہے۔ حاکم علی کی پریشانی میں وہ تمام اصول و رویے ذمہ دار ہیں جس نے انسان کے لیے انسانیت کے دروازے بند کر دیے ہیں:

"تو پھر کیا ہے کون سا ایسا مسئلہ ہے! آپ اسے سچ سچ بتا دینا کہ آپ نے میرے سے نکاح کر لیا ہے۔۔۔ ان کو تو کوئی پرواہ نہیں تھی کہ کیسے بڈھے کو تنہائی کا روگ کھا گیا۔ حاکم بھی سوچ رہا تھا کہ کیا کبھی بیٹے کا خط بھی اتنا سفاک ہو سکتا ہے؟ یہ چھوٹا سا خط تو ٹیکنوں کی چڑھائی سے بھی بڑھ گیا۔"(18)

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

شیدا اس نے زندگی، انسانی معاشرہ اور انسانیت کے قوانین کو دیکھا ہی کہاں تھا جو وہ اس فیصلے کی سنگینی کو سمجھ سکتی۔ حاکم علی نے تو ان رویوں کے درمیان ایک عمر بسر کی تھی۔ بانو قدسیہ نے اولاد کے رویے کے حوالے سے انسان دوستی کا درس دیا ہے۔

ٹائیگر ازم

ٹائیگر ازم ویسے تو جنگل اور جانوروں پر لکھا گیا افسانہ ہے جس کا حکمران شیر ہے۔ جنگل، جانور اور شیر یہ تینوں استعارے معلوم ہوتے ہیں دھرتی، انسان اور حکمران کے۔ وہ تمام سہولتیں جو مل کر مفاد عامہ کے تحت استعمال کی جا سکتی تھیں ان پر قبضے جمائے جانے لگے۔ گیدڑ شیر کی دلجوئی کرنے جاتا ہے تو وہ اپنے نظام کا موازنہ انسانی نظام سے کرتا ہے۔ شیر کہتا ہے:

"نہیں نہیں تو ٹھیک نہیں سمجھا گیدڑ! یہ تیری بھول ہے۔ جانور اس قدر پسماندہ، بے انصاف اور کمینے نہیں ہو سکتے ہم انسانوں کی طرح نہیں ہیں کہ مل جل کر نہ رہ سکیں۔"(19)

شیر کی بات انسان کے لیے قابلِ تاسف ہے کہ وہ اس مقام پر آ گیا ہے کہ جانور خود کو اس سے بہتر متصور کریں۔ یہ انسان کی واہی تباہی ہی ہے کہ اس کے خوف سے جانور بھی عاجز ہیں۔ پسماندگی، بے انصافی اور کمینگی آج کے انسان کا شعور بنتی چلی جا رہی ہے۔

ناخواندہ

مغربی معاشرت میں جس انسان دوستی کا چلن ہے بانو قدسیہ اس انسان دوستی کا پرچار کرنے سے کوسوں دور ہیں۔ صائمہ کا کردار اسی لیے وہ تخلیق کرتی ہیں:

"صائمہ کے پاس حب الوطنی کا کوئی نظریہ نہ تھا۔ کیونکہ ہر اس نظریے کو انسان دوستی ہڑپ کر گئی تھی۔۔۔ اور انسان دوستی اس پر بے معنی تھی کہ آگے نہ کوئی رسول تھا نہ خدا نہ کوئی اور منزل تھی نہ کوئی راہ۔۔۔ شادی اور محبت کھوکھلے قہقہوں کی طرح تھے۔"(20)

بے مہار اور مادر پدر خود سر آزادی کو بھی انسان دوستی کا نام دیا جانے لگا ہے۔ یہ انسان دوستی نہیں ہے بلکہ نفس دوستی ہے۔ انسان دوستی وہ ہے جس میں خاندانی نظام ہو، رشتوں کا پاس ہو، وفا کے تقاضے پورے کیے جائیں اور سب سے بڑھ کر خود سے زیادہ دوسرے انسانوں کا خیال رکھا جائے۔

مجازی خدا

"مجازی خدا" کی تابی بھی جب طوائفیت سے معتوب ہوتی ہے تو اس باعزت انسانی معاشرے میں اسے ایک گھر ایک چھت بھی ایسی نہیں ملتی جو اس کی پناہ گاہ ہو۔ وہ تابی جس کی ایک دنیا دیوانی تھی جب وہ طوائف تھی لیکن راست بازی میں اسے کیا حاصل ہوا؟ تابی بھی مجازی خدا کی آس لگاتی ہے اس انسانیت کے معاشرے سے باعزت زندگی گزارنے کے لیے ایک شخص جو اس کا محافظ ہو۔

"تابی پر نیک باعزت بیوی بننے کا بھوت سوار تھا۔ اپنے مدعا کا غلافی صورت میں پیش کرنے کا صبر کہاں جھٹ کہہ بیٹھی۔ پروانہ صاحب آپ مجھ سے نکاح کر لیجیے۔ خدا کی قسم حج اکبر کا ثواب ہو گا۔"

"پروانہ صاحب کنّی کھا کر دور جا بیٹھے۔۔۔ کاش تم نے صبر کیا ہوتا۔ یہی بات میں خود تم سے کہنے والا تھا۔ لیکن تم نے سب کچھ چھوڑا، کسبیوں والی بے شرمی نہ چھوڑی۔ تف ہے ایسی عورت پر جو زیورِ حیا سے آراستہ نہ ہو۔"(21)

یہ اور اس طرح کے کتنے ہی رویے تابی نے برداشت کیے۔ ہر ذی روح کا حق ہے کہ اسے مساوی سلوک عزت، مان دیا جائے۔ انسان دوست ہونا ایک بڑے ظرف کی بات ہے لیکن آج کے انسان کا قد اس قدر پست ہے کہ وہ اس ظرف سے عاری ہوتا جا رہا ہے۔

انترہوت اداسی

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

بانو قدسیہ انسان کو اس کے مقام و مرتبے کا احساس دلاتی ہیں۔ وہ انسان کے ان رویوں کی بھرپور عکاسی کرتی نظر آتی ہیں جس نے انھیں انسان دوستی کے دائرے سے نکال باہر کیا ہے۔"انتر ہوت کی اداسی" ایک ایسی داستان ہے جس میں ایک غریب انسان پیسے والے انسان کی ہوس کا نشانہ بنتا ہے۔ زندگی میں جو بھی انسان آیا اس نے حاجرہ کو روندتے ہوئے گزر جانا ہی مناسب سمجھا۔ کیونکہ آج کے انسان میں وہ بات مفقود ہے کہ وہ بغیر نفع کسی کی بھلائی کا خیال کرے گڈو کی امیر ماں نے بھی حاجرہ کا رشتہ اس لیے منظور کیا کیونکہ گڈو کو ان کے خاندان کی لڑکیاں تو قبول کرنے سے رہیں۔ حاجرہ کی ماں نے بھی دو وقت کی آرام سے روٹی کے لیے حاجرہ کا رشتہ کیا۔

انسان بھی عجیب ہے وہ گناہ کے اسباب بھی خود ہی مہیا کرتا ہے اور بعد میں فرشتہ سیرت ہو کر باز پرس پر اتر آتا ہے۔ حاجرہ کو اس کے سسر کی دکھ بھری داستان اور جوانی نے دھوکہ دیا۔ حاجرہ کے پیر بھاری ہونے میں اس کو جس ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑا انسانیت شرمندہ ہے۔ حاجرہ کی ساس اس کو بار بار پوچھتی رہی کہ یہ حمل کس کا ہے؟

"بول حاجرہ! کون ہے وہ۔۔۔؟ اگر تو بتادے گی تو قسم خدا کی میں حرام کی اولاد کو بھی اپنی کہوں گی۔ پر اگر تو نے نہ بتایا۔۔۔ تو۔۔۔ تجھے طلاق دلوا دوں گی۔۔۔"

"میں اپنی ساس کو بتانا چاہتی تھی لیکن مجھے اس کی صورت سے پیار تھا۔ اس کے دکھ سے گہری ہمدردی تھی۔ میں ایک ہی جملے میں اس کا دوہرا نقصان نہیں کر سکتی تھی۔ میں چپ چاپ گھر چلی آئی۔ چپ چاپ۔۔۔"(22)

انسان دوست تو ان پڑھ گنوار حاجرہ نکلی جس نے ایک عورت پر غم کا پہاڑ توڑنے کی بجائے چپ چاپ کرب کی اوٹ میں پناہ لے لی۔ حاجرہ کا کردار ایسے کئی نام نہاد انسانیت کی تبلیغ اور انسان دوستی کے دعوے داروں کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ ہے۔

بابو قدسیہ نے اپنے افسانوں میں مختلف حوالوں سے انسانی زندگی کے دکھ اور تکالیف کو بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان دوستی کے عناصر بھی نظر آتے ہیں جس سے ان مظلوم لوگوں کی زندگی آرام دہ بن سکتی ہے۔ اس طرح بانو قدسیہ نے اپنے افسانوں میں انسان دوستی کا درس دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، (مرتبہ) قومی انگریز اردو لغت، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1994ء، ص:934

2. The Oxford English Dictionary, vol v, Oxford university press, Amen house, London, 1961, P: 444

3. Encyclopedia of philosophy, New York: the macmillan company and the free press N.York, 1966, P: 204

۴۔ النحل: 90

۵۔ بانو قدسیہ، آتش زیرپا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص: 6

۶۔ ایضاً، ص:107

۷۔ ایضاً، ص:119

۸۔ ایضاً، ص:147

۹۔ بانو قدسیہ، دست بستہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2015ء، ص: 70۔71

۱۰۔ ایضاً، ص:172

۱۱۔ ایضاً، ص:180

۱۲۔ ایضاً، ص:220

۱۳۔ بانو قدسیہ، سامانِ وجود، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2018ء، ص: 2

۱۴۔ ایضاً، ص:99

Vol.3 No.4 2020

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

۱۵۔ بانو قدسیہ، ناقابلِ ذکر، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2016ء، ص:105

۱۶۔ ایضاً، ص:113

۱۷۔ ایضاً، ص:236

۱۸۔ بانو قدسیہ، دوسرا دروازہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2015ء، ص:130

۱۹۔ ایضاً ص:۱۳۳

۲۰۔ بانو قدسیہ، توجہ کی طالب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2010ء، ص ایضاً، ص:200

۲۱۔ ایضاً، ص:262

۲۲۔ ایضاً، ص:719۔718